Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:11 (1967)

# شاعرِ اسلام اقبالؒ

☆ مولانا محمد علی مرحوم

مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے اردو اخبار ہمدرد میں ۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال پر چند مضامین لکھے تھے، مندرجہ ذیل مضمون اُن میں سے ایک ہے۔ مولانا مرحوم علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے، اور اس کا وہ اکثر ذکر کیا کرتے تھے کہ مجھے اسلامیت کے رنگ میں رنگنے والا ایک اقبال بھی ہے، مولانا محمد علی جب کراچی جیل میں تھے (۱۹۲۱ء، ۱۹۲۳ء) تو انہوں نے انگریزی زبان میں اپنی آپ بیتی کی قسم کی ایک چیز لکھنی شروع کی تھی۔ اس میں وہ علامہ اقبال کا ذکر یوں کرتے ہیں ۔

"انہی دنوں (جنگِ عظیم کے دوران کی نظربندی) ایک حد تک تکلیف دہ وقفے کے بعد جو اس قسم کے اعلیٰ اور اس کے ساتھ ہی پُر قوت ادب کے لئے میری اپنی خواہش کی وجہ سے مجھے یہ وقفہ اور بھی طویل محسوس ہو رہا تھا، ہمیں (مولانا محمد علی اور اُن کے بھائی مولانا شوکت علی ایک ساتھ نظر بند تھے) اپنے دوست سر اُس وقت صرف ڈاکٹر تھے، محمد اقبال ایم اے، پی ایچ ڈی، بار ایٹ لا کے، یہ اُن کے پورے پیشہ ورانہ اور علمی القاب تھے، شاعری کے دو مختصر سے مجموعے ملے (اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی)، میں اقبالؒ کو پہلے سے جانتا تھا اور میری طرح ہندوستان کے دوسرے لاکھوں مسلمان بھی جو اُن سے کئی سالوں تک ناواقف رہے، انہیں اسی نام سے جانتے تھے، بعد میں جب بھی میں کبھی اپنی کاروباری ضرورتوں کے لئے لاہور جاتا، تو اپنے آپ کو اُن پر ٹھونس دیا کرتا اور اس طرح ان کی مہمان نوازی کا مستحق ہوتا، وہ لاہور میں ان دنوں وکالت کرتے تھے، اس سے وہ اتنا کماتے، جو اُن کی اوسط درجے کی زندگی گزارنے کے لئے کافی ہوتا، تاکہ وہ آرام سے حقہ پی سکیں اور ادب اور فلسفہ میں سے اپنے محبوب موضوعات کا مطالعہ کر سکیں، اور اس کے علاوہ اپنی زوردار شاعری سے مسلمانوں کو تقویت بخش سکیں۔

"میں نے ابھی اقبال کا ایک شعر بھی نہیں پڑھا تھا کہ بہت سے لوگ، جو سے کئی سال سے اقبال کی عظمت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اعتراف کرچکے تھے لیکن اس سلسلے میں میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ جب ایک دفعہ میں اُن کے سحر کے اثر میں آگیا تو پھر میں نے اس ضمن میں پہلے زمانے کی بہت کچھ تلافی کردی۔ میں نے اُن کا وہ سب کلام جو میں اُردو کے رسالوں اور اخبارات سے حاصل کرسکا، بار بار پڑھا، اور اس کے علاوہ میں نے اپنے اخبارات (ہمدرد اور کامریڈ) کے قارئین کو بھی اپنی اس شدید لذت اندوزی میں برابر کا شریک کیا۔ غالب جو شاید ہمارے اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اس زمرے سے اُن سے قدیم تر میر بھی خارج نہیں، جن کی غیر معمولی ذہانت کو خود غالب بارہا خراج پیش کرچکے ہیں، ان دونوں شاعروں کا کلام اس سے پہلے صحافت میں کبھی اتنی کثرت سے نقل نہیں ہوا جتنا کہ "کامریڈ" میں، جس کی شہادت "کامریڈ" کے پڑھنے والے دے سکتے ہیں، اور اب اقبال بھی جو شاید غالب کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ہیں، "کامریڈ" کے کالموں میں اس "عزت" میں برابر کے شریک تھے۔ اور اسی طرح "ہمدرد" میں بھی جس کے لئے اُنھوں نے خود کئی بار اپنا تازہ کلام مرحمت بھی فرمایا۔

اقبال اس بیسویں صدی میں ہندوستان میں اسلام کی نئی بیداری کے شاعر تھے، اور اس بارے میں اسلامی ہند پنجاب کے اس منکسر المزاج شرمیلے اور تنہائی پسند بیرسٹر سے زیادہ کسی اور آدمی کا ممنون احسان نہیں، اُن کا نام تمام اُردو بولنے والی اسلامی دنیا میں ہر ہر گھرانے کی زبان پر تھا، اور میں تو اُن کا پُرجوش مداح اور پرستار تھا ہی، لیکن اگر کوئی ایک آدمی اور تھا جس کا اقبال کے لئے جوش اور ولولہ نہ صرف میرے برابر تھا، بلکہ مجھ سے بڑھ کر تھا اور اس معاملے میں میرے اور ان کے درمیان بہت کافی فرق تھا، تو یہ میرے بھائی تھے۔ اُن کی تقریریں اقبال کے اشعار سے اتنی بھری ہوتیں اور وہ ان اشعار کو اس ذوق و شوق سے پڑھتے کہ میں اپنے رشک کو دبا نہ سکتا اور انہیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتا کہ جب اُن کی مصنوعی اور سُلا دینے والی فصاحت حاضرین کو ہلکی دلکی چال سے زیادہ چلنے پر آمادہ نہیں کرسکتی تو وہ اقبال کے کثرت سے اشعار پڑھ کر اُن کے جوش کو ابھارتے ہیں۔

"اب ہمارے پاس اقبال کے کلام کے جو نئے مجموعے آئے، تو میرے بھائی نے دیکھا کہ اس دفعہ اقبال نے فارسی میں شعر کہے ہیں اور یہ کہ اس کے لئے مجھے اور اُن کو اس زبان کے سلسلے میں ایک عمر پہلے اپنے سرخ ریش استاد سے رام پور میں جو کچھ حاصل کیا تھا، اسے از سرِ نو کچھ نہ کچھ تازہ کرنا ہوگا۔ اس پر میرے بھائی اپنے منظوم نظر شاعر پر برس پڑے۔

"بہر حال ہم نے اقبال کے اس نئے مجموعہ "اسرارِ خودی" کا مطالعہ شروع کردیا، اور جوں جوں ہم اس مطالعے میں آگے بڑھے، اقبال پر میرے بھائی کا غصہ فرو ہوتا گیا، کیوں کہ ہمیں بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اقبال نے اب تک

جو کچھ لکھا ہے، ان کا یہ فارسی کلام اس سے کہیں زیادہ عظیم تر اور پائدار ہے، اور اس کا دائرۂ اثر بھی اسلامی دنیا میں جہاں کے لئے اردو زبان کافی نہ تھی، زیادہ وسیع ہوگا، ان کی اردو شاعری کے مقابلے میں جو کوہِ آتش فشاں سے بہنے والے لاوا کی طرح تھی، اسرارِ خودی کی یہ فارسی شاعری شروع شروع میں زیادہ سنجیدہ اور نہ زیادہ شکل و پائدار نظر آتی تھی، لیکن جیسے ہی اقبال کتاب کے شروع کے حصے میں اپنے فلسفہ کی تشریح سے فارغ ہوئے۔ جس میں انہوں نے بتدریج اپنے پیشِ نظر موضوع کی وضاحت کی ہے، اور مشرقی قارئین کو "خودی" کی پرانی اصطلاح کے نئے معانی اور اپنے مخصوص فلسفے سے متعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد وہ "پی ایچ ڈی" نہیں رہے، بلکہ ایک شاعر بن گئے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ سنگِ مرمر کی رگوں میں بھی آتشیں مادہ سیال رواں دواں ہے۔

" میں نے اس کتاب کے بعض حصے جب کہ وہ لکھے جا رہے تھے، خود اقبال کی زبان سے لاہور میں سنے تھے، اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب پنجاب چیف کورٹ میں "کامریڈ" کی ضمانت کا مقدمہ زیرِ سماعت تھا، اور مجھے اس سلسلے میں اکثر لاہور جانا پڑتا تھا لیکن جیسا کہ قرآن کے معاملہ میں میرا حال تھا، اسی طرح یہاں بھی میں جزئیات سے کُل کا اندازہ نہ کر سکا تھا، لیکن اب جب کہ کتاب کا پورا خاکہ بتدریج نظروں کے سامنے آیا تو یہ دیکھ کر میرے اندر خوشی کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی کہ شاعر اور فلسفی نے اپنے بے مثل اندازِ بیاں میں اسلام کی بعینہٖ اسی بنیادی حقیقت کو پیش کیا ہے، جسے خود میں نے بھی اِدھر اُدھر کی ٹھوکریں کھا کر تلاش کیا تھا۔

" یہاں میں ایک بات کی وضاحت کر دوں، مسلمانوں کے مذہبی ادب میں عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ اسلام کے معنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے ہیں، اور یہ کہ اللہ تعالےٰ کائنات کا فرمان روائے اعلیٰ ہے، لیکن علمائے دینیات نے اس حقیقت کو ایک غیر اہم پیش پا افتادہ بات بنا دیا ہے، چنانچہ حالت یہ ہے کہ یہ سوچتے ہوئے کہ ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں، ہم اس کے پاس سے گزر جاتے ہیں، حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کی صحیح قدر و قیمت سے مکمل طور پر بے خبر ہوتے ہیں، ضرورت تھی کہ اس حقیقت کی پرانی قدر و قیمت کو بحال کرنے کے لئے از سرِ نو زور دیا جاتا اور اس پر خاص طور سے توجہ دی جاتی، مسلمان اس وقت تک زندگی کے عظیم مقصد کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے تھے اور نہ وہ سچے مسلمان کی حیثیت سے رہنا سیکھ سکتے تھے، جب تک کہ اُن کے اس تصور میں پوری تبدیلی نہ ہوتی، اس ضمن میں میرے دماغ میں میرے اپنے انداز پر یہ خیال تھا جس کی اس کتاب کو پڑھ کر اب پوری طرح تصدیق ہو گئی۔

" میں نے دیکھا کہ اقبال اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہن کا دروازہ زبردستی کھول رہا ہے، اور اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اسلام کے حکومت الٰہی کے تصور کے لئے ایک بار پھر داخل ہونے کا راستہ بنا رہا ہے۔ اس حقیقت کی پرانی قدر و قیمت کو بحال کرنے کی کس قدر ضرورت تھی، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ کو اپنی دوسری کتاب رموزِ بے خودی" میں اس کی وضاحت کرنی پڑی، اور انہوں نے تقریباً حلفیہ اس کا اعلان کیا کہ ان کتابوں میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ قرآن کی تعلیمات پر مبنی ہے نہ کہ یہ جرمن فلسفہ ہے جیسا کہ علماء سمجھ رہے ہیں" (مدیر)

---

اقبالؔ کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک محدود تھا، اور "ترانہ ہندی"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اور "دنیا شوالہ" سب اسی دور کی نظمیں ہیں، ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک دوسرا دور چلا، اور ۱۹۰۸ء سے وہ آخری دور چلنا شروع ہوا، جو بظاہر اب تک چل رہا ہے۔ اس آخری دور کا آغاز "بلادِ اسلامیہ" کی نظم سے ہوتا ہے، جس میں دہلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ کے بعد یثرب کا نمبر آتا ہے، مگر اس طرح آتا ہے کہ :-

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفےٰؐ
دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا

خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے وارث مسندِ جم کے ہوئے

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام،
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

اقبالؔ جب حقیقت کی طرف جلد جلد ترقی کر رہے تھے، اس کے بعد "گورستانِ شاہی" پر جو نظم لکھی گئی، اس میں البتہ چند شعر ایسے ہیں کہ ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر اب بھی بعض اوقات چیزوں پر ایک سطحی نظر ڈال رہا ہے۔

ہے تو گورستاں مگر یہ خاکِ گردوں پایہ ہے
آہ ایک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

اس سے تو خیال ہوتا ہے کہ اقبالؔ بھی ان تاریخوں کے مؤلفوں کی طرح جو اسکولوں کی خواندگی میں داخل کی جاتی ہیں، اقوام کو بادشاہوں سے میز نہ کر سکے، وہ خود پوچھتے ہیں کہ ؎

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل؟
جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

اور خوب کہتے ہیں کہ

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور     جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

اور یہ بھی صحیح فرماتے ہیں کہ

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار     رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

لیکن اگر مسلمان بھی ایک "قوم" ہیں اور کوئی امر مانع نہیں کہ وہ اسلام پر قائم رہیں تو پھر یہ ہرگز صحیح نہیں کہ

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار     رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار     ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو     مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گذار     چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجدار

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں     دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں

آدبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے     عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا     آسماں سے ابرِ آزاری اٹھا، برسا، گیا

اگر یہ صحیح ہے تو صرف اس معنی میں کہ خدا نئی نئی قوموں کو مسلمان کرتا رہے گا، اور انہیں کے ذریعے ابد تک اسلام کو قائم رکھے گا۔

افسوس ہے کہ اقبالؔ بھی نفس پرست مسلمان بادشاہوں ہی کے زمانے کو "عہدِ رفتہ" سمجھے، اور انہوں نے فرمایا کہ ؎

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ اُمت بھولنے والی نہیں

ہاں اس اُمت کو اپنے شاہوں کو بھولنا تو نہیں چاہیے، انہیں نے حضرت معاویہؓ کے زمانے سے لے کر سلطان محمد وحیدالدین کے زمانے تک اپنی ذات اور اپنے خاندان کے مفاد کو اُمتِ محمدیہ اور ملتِ اسلامیہ کے مفاد پر ترجیح دی، اور ہم کو تباہ و برباد کرایا۔ اقبالؔ اس وقت بالکل صحیح راستے پر نہ تھے، مگر بحمد اللہ جنگِ عمومی تک اس پر آپڑے، اور خدا ضرور ان کو ان حقیقتوں کو آشکار کرنے کی جزائے خیر دے گا کہ ؎

ہر کہ پیماں با ھو الموجود بست     گردنش از بندِ ہر معبود رست

مومن از عشق است و عشق از مومن است     عشق را ناممکنِ ما ممکن است

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عشق سفاک است او سفاک تر
پاک تر، چالاک تر، بیباک تر

آن کند تعمیر تا ویران کند،
این کند ویران که آبادان کند

عقل می گوید که خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن

عشق گوید شاد شو آباد شو
عشق گوید بنده شو آزاد شو

عشق را آرام جان حریت است
ناقه اش را ساربان حریت است

آن شنیداستی که هنگام نبرد
عشق با عقل هوس پرور چه کرد

آن امام عاشقان پور بتولؓ
سرو آزادی ز بستان رسولؐ

بهر آن شهزادهٔ خیر الملل
دوش ختم المرسلین نعم الجمل

سرخ رو عشق غیور از خون او
شوخی این مصرع از مضمون او

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید
این دو قوت از حیات آید پدید

زنده حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

چون خلافت رشته از قرآن گسیخت
حریت را زهر اندر کام ریخت

خاست آن سر جلوهٔ خیر الامم
چون سحاب قبله باران در قدم

بر زمین کربلا بارید و رفت
لاله در ویرانه ها کارید و رفت

تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

بهر حق در خاک و خون غلطیده است
پس بنای لا اله گردیده است

تیغ بهر عزت دین است و بس
مقصد او حفظ آئین است و بس

ماسوا الله را مسلمان بنده نیست
پیش فرعونی سرش افگنده نیست

خون او تفسیر این اسرار کرد
ملت خوابیده را بیدار کرد

تیغ لا چون از میان بیرون کشید
از رگ ارباب باطل خون کشید

نقش الا الله بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

رمز قرآن از حسین آموختیم
ز آتش او شعله ها اندوختیم

شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطه هم از یاد رفت

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز ، تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

اس سے زیادہ بادشاہت کی کیا مذمت ہو سکتی تھی، کاش آج بھی اقبالؔ کو کربلا کی فتح نمایاں اس طرح یاد ہوتی، اور ارضِ پاک حجاز میں[1] "یزیدیت" کے مقابلے کے لئے وہ بھی "شبیریت" کا علم لے کر نکلتے، اور بجائے کونسل[2] کے داخلے کے موتمر عالمِ اسلام میں شرکت فرماتے، "گورستانِ شاہی میں" انہوں نے مسلم کو بھی یزید کی طرح رخصت کر دیا، لیکن "رموزِ بےخودی" میں وہ صحیح راستے پر آ پڑے، اور انہوں نے خوب فرمایا کہ

در بہاراں جوشِ بلبل دیدہٴ رستخیزِ غنچہ و گل دیدہٴ
چوں عروساں غنچہ ہا آراستہ از زمیں یک شہر انجم خاستہ
غنچہٴ برمی دمد از شاخسار گیردش بادِ نسیم اندر کنار
غنچہ از دستِ گلچیں خوں شود از چمن مانندِ بو بیروں رود
بست قمری آشیاں بلبل پرید قطرہٴ شبنم رسید و بو رمید
رخصتِ صد لالہٴ ناپایدار کم نسازد رونقِ فصلِ بہار
از زیاں گنجِ فراوانش ہماں محفلِ گلہائے خندانش ہماں
فصلِ گل از نسترن باقی تر است از گل و سرو و سمن باقی تر است
ہم چناں از فرد ہائے پے سپر ہست تقویمِ اُمم پائندہ تر
در سفر یار است و صحبت قائم است فرد رہ گیر است و ملت قائم است
فرد پور شصت و ہفتاد است و بس قوم را صد سال مثلِ یک نفس
زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگِ فرد از خشکیٴ رودِ حیات مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

---

[1] مولانا محمد علی مرحوم کو سرزمین حجاز پر شاہ ابن سعود کے ملک الحجاز بننے پر اعتراض تھا، اور اُس وقت وہ اِس کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ (مدیر)

[2] علامہ اقبالؔ مرحوم اُس وقت پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد — از اجل فرماں پذیرد مثلِ فرد
اُمتِ مسلم ز آیاتِ خداست — اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است
از اجل ایں قوم بے پرواستے — استوار از نحن نزلنا استے
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است — از دوامِ او دوامِ ذاکر است
تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است — از فسردن ایں چراغ آسودہ است
ماکہ توحیدِ خدا را حجتیم — حافظِ رمزِ کتاب و حکمتیم
آسماں با ما سرِ پیکار داشت — در بغل یک فتنۂ تاتار داشت
بندہا از پا کشود آں فتنہ را — بر سرِ ما آزمود آں فتنہ را
خفتہ صد آشوب در آغوشِ او — صبحِ امروزے نزاید دوشِ او
سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید — دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس — زاں نو آئین کہن پندار پرس
آتشِ تاتاریاں گلزار کیست — شعلہ ہائے او گلِ دستار کیست
زانکہ ما را فطرتِ ابراہیمی است — ہم بمولیٰ نسبتِ ابراہیمی است
از تہِ آتش بر اندازیم گل — نارِ ہر نمرود را سازیم گل
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار — چوں بباغِ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرمِ بازاری نماند — آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونقِ خم خانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند — استخواں او تہِ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود ست و ہست — ملتِ اسلامیاں بود ست و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم است — امتزاجِ سالماتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است — از شرارِ لا الٰہ تابندہ است
گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما — گلستاں میرد اگر میریم ما

تعجب ہے کہ جو شخص جانتا تھا کہ شوکت و فر بغداد و سطوتِ غرناطہ، اس میں اسلام کی حقیقت نہ

تھی بلکہ اس کی حقیقت تھی تو مدینہ منورہ میں اور کربلائے معلیٰ میں تھی، جو شخص جانتا تھا کہ بغداد پر وہ کچھ گذرا جو روما پر نہ گزرا، پھر بھی تاتاریوں کے اٹھائے ہوئے محشر کا یہی نتیجہ نکلا کہ ہلاکو ہی کی قوم نہ صرف مسلمان ہوئی بلکہ اس نے از سرِ نو یورپ میں داخل ہو کر اس کی زمین میں پھر اسلام کا جھنڈا گاڑا، اور ہلاکو کی تباہ کی ہوئی خلافت کو پھر زندہ کیا، اور چار سو برس تک زندہ رکھا۔ جو شخص جانتا تھا کہ رومیوں کی گرم بازاری اور جہاں گیری اور جہانداری آج باقی نہیں۔ ساسانیوں کا شیشہ چکنا چور ہو گیا، خم خانۂ یونان کی رونق نہ رہی، اور مصر بھی فراعنہ کی ہڈیوں کی طرح اہرام کے تلے دب گیا، مگر بانگِ اذاں جیسے تیرہ سو برس پہلے تھی آج بھی ہے اور ملتِ اسلامیاں اگر نہ رہے گی تو دنیا بھی نہ رہے گی کیونکہ

ع گلستاں میرد اگر میریم ما

وہ بادشاہوں کے اُجڑے ہوئے گورستان کو دیکھ کر یہ کس طرح کہہ سکا کہ

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا — آسماں سے ابرِ آزاری اُٹھا، برسا، گیا

یقیناً اس وقت تک حقیقت کا پورا پورا انکشاف نہ ہوا، مگر یہ ظلم ہوگا کہ میں اس کو بھی ظاہر کردوں کہ اس نظم کے آخر میں اقبال نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم — آخری بادل ہیں اِک گذرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گوہر اس ابر کے آغوش میں — برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیٔ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ — خواب سے امیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور — ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

تاہم میرے نزدیک جو کچھ اسلامی بادشاہوں نے دکھایا وہ اکثر اسلام کی شانِ جلالی کا بھی ظہور نہ تھا، وہ شانِ جلالی جو ہر زبردست زیردست کو دکھا سکتا ہے اسلام کی شانِ جلالی نہیں، اسلام کی شان جلالی کو تو صرف وہی دکھا سکتا ہے جو اسلام کی شانِ جمالی کو دکھا سکے اور جو ابھی اسلام کی شانِ جمالی کو دکھا سکتا ہے وہ یقیناً اس کی شانِ جلالی بھی دنیا کو ایک بار پھر دکھا دے گا۔ میں نے اقبال کی اردو اور فارسی نظموں سے اتنے طول و طویل اقتباسات بلا وجہ نہیں دیئے ہیں۔ قارئین کرام ذرا صبر فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس مضمون سے ان کا کتنا تعلق ہے، میں عرض کر رہا تھا کہ اقبال کی شاعری کا جو تیسرا دور سنہ ۱۹۰۸ء میں شروع ہوا، اور اب تک جاری ہے، اس کی ابتدا، انہیں دو نظموں سے ہوئی، لیکن حقیقتاً اس تمام دور کی شاعری کا لبِ لباب اور مشتے نمونہ از خروارے وہی "ترانۂ ملی" تھا جس کا ذکر آج کے مضمون کو شروع کرتے ہی میں نے کر دیا تھا، میں کہہ چکا ہوں کہ آج کون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہے جس نے یہ ترانہ نہیں سُنا، لیکن پھر بھی دل مجبور کر رہا ہے کہ اس کے وہ شعر نقل کر دوں، جن میں ملّتِ اسلامیہ کی تفسیرِ حیات اور ہمارے خواب کی صحیح ترین تعبیر کا اظہار کیا گیا ہے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے ۔۔۔ آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ۔۔۔ ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں ۔۔۔ خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری ۔۔۔ تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم ۔۔۔ سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا ۔۔۔ اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا ۔۔۔ ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اسی ترانۂ ملّی کے بعد "وطنیت" پر اقبال کی نظم ہے، جس کا پہلا بند یہ ہے ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ۔۔۔ ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور ۔۔۔ تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے ۔۔۔ جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس نظم میں وہی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جن کا رموزِ بیخودی میں اسلام کو تہذیبِ مکانی سے آزاد ظاہر کرنے کے متعلق اظہار کیا گیا ہے، چنانچہ اقبال نے "وطنیت" کی تقسیم کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے کہ ؎

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے ۔۔۔ قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس کی قومیت ساری نوعِ انسان پر حاوی ہے، اور اقبال نے طارق کے منہ سے اس کا خیال بہترین طریقے پر اظہار کر دیا۔

؏ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اپنی اُردو نظموں کے مجموعہ کا نام انہوں نے "بانگِ درا" رکھا ہے، اور وہ اسی ترانۂ ملّی سے لیا گیا ہے، جس کے ذکر سے اس مضمون کی ابتدا کی گئی تھی یعنی ؏ "اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا" ـــــ اور اس نے اقبال کے پہلے خیال کی کہ ؏ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ـــــ تردید کر دی اور اس کی اس طرح تصحیح کر دی کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

(۱۰ ہمدرد ۔ ۱۹۲۷ء)